

جذبہ

05-02-2017



پیارے بچے



فہرست

بچوں کی دنیا

۱. انوکھی سزا
۲. آخری گولی
۳. بہادر لڑکا
۵. بھوت
۶. ترقی
۷. تین دوست
۹. سیدھا راستہ

انوکھی سزا

مصنف: یوسف

”حسن بیٹا، دوکان سے ایک کلو چینی جلدی سے لے آؤ،“ حسن کی امی نے حسن کو دیکھ کر بلند آواز سے کہا۔ حسن اس وقت کھیل کر گھر میں داخل ہو رہا تھا۔



”جی امی! ابھی جاتا ہوں“ حسن نے جواب دیا، اور گھر سے کچھ ہی دور موجود دوکان کی طرف چل پڑا، دوکان پر پہنچ کر حسن نے ایک کلو چینی کا آرڈر دیا۔

دوکاندار حسن کی بات سن کر مڑا اور دوکان کے اندرونی حصے کی طرف چینی لینے کے لئے چلا گیا، اسی دوران حسن کی نگاہ دوکان میں سامنے ریٹنگ پر رکھے ایک ڈبہ پر پڑی جو رنگ برنگے کیکوں سے بھرا پڑا تھا، حسن اس وقت بھوکا تھا، اسکے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا اس نے دوکاندار کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر جلدی سے ایک کیک اٹھایا اور منہ میں ڈال کر نگٹے کی کوشش کرنے لگا، اسی دوران دوکاندار واپس آگیا، اور حسن کو چینی دی، حسن نے چینی لے کر رقم ادا کی، اور گھر کی طرف چل پڑا۔

حسن دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ دوکاندار اسکی چوری کو نہیں دیکھ سکا، اور کیک مفت میں اس نے کھا لیا، کیک کا ذائقہ حسن کو بہت اچھا لگا، لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جب سے اس نے کیک کھایا ہے اسکے گلے میں کوئی چیز پھنس سی گئی ہے۔

حسن گھر پہنچا، ماں کو چینی تھائی اور ایک کمرے میں موجود آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا، حسن نے اپنا منہ کھولا اور آئینے کی مدد سے گلے میں جھانکنے لگا، کہ وہ کون سی چیز ہے جو اس کے گلے میں پھنس گئی ہے، اور اب تو درد بھی ہونے لگا تھا۔ حسن زور لگا کر پورا منہ کھولنے کی ناکام کوشش کرتا رہا، مگر اسے کوئی چیز نظر نہیں آئی۔

ابھی حسن آئینے کے سامنے کھڑے منہ کھولے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک حسن کی امی کمرے میں داخل ہوئیں اور حسن کو یوں منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر حیران ہوئیں، اور پوچھا، حسن بیٹا اس طرح منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔

حسن اپنی امی کو سامنے دیکھ کر گھبرا گیا، اور بولا، نہیں امی، بس ویسے ہی کھڑا ہوں۔

ابھی حسن نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے گلے میں ایسا شدید درد ہوا جیسے اسکے گلے کو کسی نے تیز دھار آلے سے کاٹ دیا ہو، حسن وہیں زمین پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔

حسن کی امی یہ دیکھ کر گھبرا گئیں کہ اچانک میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟ حسن کی امی نے جلدی سے حسن کو سیدھا کر کے بستر پر لٹایا اور پوچھا کہ کیا ہوا ہے بیٹا؟

حسن مسلسل چیخے، چلائے جا رہا تھا، اس کے گلے سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں، اسکے منہ سے ہلکا سا خون بھی باہر نکل رہا تھا اب حسن کو یقین ہو گیا تھا کہ اسکے گلے میں کوئی چیز موجود ہے جسکی وجہ سے اسکی یہ حالت ہو گئی ہے۔ حسن کی امی یہ سب دیکھ کر شپٹا گئیں اور زور زور سے سب گھر والوں کو آوازیں دینے لگیں، حسن کے ابو، دادا، دادی، بہن، بھائی سب دوڑے چلے آئے، اور حسن کی حالت دیکھ کر سب گھبرا گئے۔

حسن کے دادا نے جلدی سے پانی منگوا یا اور حسن کو بہت سا پانی پلایا لیکن کچھ افادہ نہ ہوا۔ حسن کا درد اور ٹھیں ویسی ہی رہیں، اس کی حالت غیر ہو رہی تھی، وہ دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا، جب اس نے چوری چھپے وہ کیک کھایا تھا۔

حسن کی دادی اماں نے ایک روٹی کا ٹکڑا منگوا یا اور حسن کے منہ میں ڈال دیا، حسن نے اس روٹی کے ٹکڑے کو باہر اگل دیا، اس سے کچھ نہیں کھایا جا رہا تھا۔

تب حسن کے ابو نے سختی سے پوچھا کہ حسن سچ سچ بتاؤ کیا کھایا تھا جس کی وجہ سے یہ حالت ہو رہی ہے، حسن نے جب یہ دیکھا کہ اب بتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، تو اس نے روتے ہوئے شرمندہ لہجے میں سب کو بتادیا کہ اس نے دوکاندار کی نظروں سے بچ کر ایک کیک کھایا تھا تب سے اس کے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی ہے۔

حسن کے ابو نے ایک خشک روٹی کا بڑا سا ٹکڑا منگوا یا اور حسن کو اسکے نگٹے کا حکم دیا، حسن نے بہت انکار کیا، مگر اس کی ایک نہ چلی، مجبوراً اس نے وہ ٹکڑا منہ میں رکھا اور اسے نگٹے کی کوشش کرنے لگا، حسن کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، وہ برے برے منہ بنا رہا تھا، اور دل میں اپنے آپ پر لعن طعن کر رہا تھا کہ کاش وہ کیک کھانے کی غلطی نہ کرتا۔



حسن مسلسل اس خشک روٹی کے ٹکڑے کو نگٹے کی کوشش کر رہا تھا، کہ اچانک اسے زوردار ایکاٹی آئی اور

مسلسل تے شروع ہو گئیں، جیسے ہی تے رکی، حسن کو گلے میں کچھ سکون محسوس ہوا، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب اسکے گلے میں کوئی چیز نہیں ہے، اب اسے درد بہت کم محسوس ہو رہا تھا۔ حسن کے ابو اب اس تے کو دیکھ رہے تھے کہ آخر کیا چیز حسن کے گلے میں پھنس گئی تھی، اسی کے کاٹنے کی وجہ سے حسن کی حالت غیر ہو گئی تھی، چپوٹے کا پچھلا حصہ ہے اور یہی چپوٹا حسن کے گلے میں پھنس گیا تھا، اسی کے کاٹنے کی وجہ سے حسن کی حالت غیر ہو گئی تھی، چپوٹے کا پچھلا حصہ ہے اور یہی چپوٹا حسن آگئی تھی کہ جب حسن نے جلدی سے کیک اٹھا کر منہ میں ڈالا تھا، تو اس وقت وہ چپوٹا اس کیک پر بیٹھا تھا، وہ بھی کیک کے ساتھ حسن کے منہ میں چلا گیا، لیکن پیٹ میں جانے کی بجائے حلق میں پھنس کر رہ گیا، اور باہر نکلنے کی مسلسل کوشش کرنے کی وجہ سے حسن کو یہ سب کچھ چھیلنا پڑا۔ حسن کو اس کے کیے کی سزا مل چکی تھی۔ وہ سب گھر والوں کے سامنے ندام کھڑا تھا۔ حسن کے ابو نے حسن کو گلے سے لگا لیا اور معاف کر دیا۔ اور وعدہ لیا کہ آئندہ حسن کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

اگلے دن جب حسن کی حالت کچھ سنبھل گئی تو حسن کی امی نے حسن کو پانچ روپے دیے اور کہا کہ جاؤ بیٹا یہ پیسے دوکاندار کو دے آؤ۔ یہ اس کیک کے پیسے ہیں جو تم نے کھل کھایا تھا، حسن اسی دوکان پر چلا گیا اور دوکاندار سے کہا کہ معذرت اٹکل، کل آپکی دوکان سے میں نے غلطی سے کیک کھایا تھا اور پھر حسن نے جیب سے پیسے نکالے اور دوکاندار کی طرف بڑھا دیئے۔ دوکاندار حسن کی اس ایمانداری کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور سامنے پڑے ہوئے اسی کل والے کیک کی طرح ایک اور کیک نکال کر حسن کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ یہ کیک لے لو بیٹا، یہ میری طرف سے اس ایمانداری کا انعام سمجھ کر کھا لو، حسن نے جیسے ہی کیک دیکھا اسے کل خود کے ساتھ بیٹا ماجرا یاد آگیا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسکے گلے میں پھر سے کوئی چیز پھنس گئی ہو حسن فوراً گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ دوکاندار حسن کو یوں بھاگتا دیکھ کر حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ کتنا پیارا اور نیک بچہ ہے، ایسا بچہ آجکل کہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اب اسے کیا معلوم کہ حسن کے ساتھ یہ کیک کھانے کی وجہ سے کیا یقینی۔ حسن نے گھر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ کبھی چوری نہیں کرے گا اور نہ ہی کبھی کیک کھائے گا۔ یوں حسن کی پہلی غلطی اس کی آخری غلطی بن گئی۔

آخری گولی

مصنف: یوسف

وہ کل پانچ افراد تھے، تین مرد اور دو عورتیں۔ شام کے وقت ساحل سمندر کے ایک ویران گوشے میں، پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دائیں طرف سمندر کی منہ زور لہریں ٹھانٹیں مار رہی تھیں اور بائیں طرف ایک اونچی پٹان سر اٹھائے کھڑی تھی، جو کسی پہاڑی کا باقی ماندہ حصہ تھی۔ چند قدم دور چار پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں اس گروپ کے چیف کا نام تھا شفقت اگرچہ شفقت نام کی کوئی چیز اس کے چہرے پر دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا، چٹان کی طرح مضبوط اور پتھر کی طرح پتھریلا۔ چیف نے اچانک پہلو بدلا اور بولا:

"خواتین و حضرات آپ سب ملک کی خفیہ تنظیم کے ارکان ہیں۔ آپ کی مناسب کارکردگی کو مد نظر رکھ کر آپ کو ایک خفیہ مشن سونپا گیا۔ آپ میری ہدایات کے مطابق اپنا کام احسن طریقے سے سر انجام دیتے رہے مگر پھر ہم میں سے کسی نے ایک "کارنامہ" بھی سر انجام دے دیا، خفیہ سی ڈی کے چند منتخب حصے دشمن کے ہاتھوں فروخت کر دیے گئے۔"

چیف پھر اچانک خاموش ہو گیا وہ گرم نظروں سے ایک ایک کا چہرہ بڑھ رہا تھا، ہر ایک کو بری طرح گھور رہا تھا، بات ہی ایسی تھی، ملک سے غداری اور تنظیم سے بے وفائی۔ چیف نے سرد ہوا سے بچائو کے لیے عمدہ ادنیٰ مفلر لے رکھا تھا۔ اس نے اپنا چرمی تھیلا کھول کر اس میں سے ایک سیاہ بڑا پستول نکالا۔ اس ماحول میں اس کی کرخت آواز پھر گونجی:

"غداری کی سزا موت ہوتی ہے، آپ سب جانتے ہیں کہ خفیہ ادارے غدار کو موت کے گھاٹ اتار کر دوسرے برے افراد کے لیے عبرت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کیا کسی کو اس بات پر اعتراض تو نہیں کہ غدار کو مارا نہ جائے؟"

"نو چیف" چند ملی جلی آوازوں نے سر جھکا دیا۔ "گلد تو گویا آپ سب اس تنظیم کے ایچے کارکن ہیں۔" چیف نے اپنی جیب میں سے تین گولیاں نکال کر پستول کو کھولا اور اس کے چیمبر میں وہ گولیاں ڈال دیں۔ پھر پستول کی نال ہوا میں بلند کی اور ٹریگر دبا دید۔ چیف نے دو گولیاں فضا میں چلا کر ضائع کر دیں۔ اب آخری گولی باقی تھی۔

"غدار کی قسمت کا فیصلہ اب یہ آخری گولی کرے گی۔" چیف نے زبان کھولی تو سب کے چہروں پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ غدار کی نامزدگی کے بغیر ہر ایک شخص اپنے آپ کو مجرم اور غدار سمجھ رہا تھا کہ کہیں غداری کا اس پر کوئی الزام تو نہیں لگ گیا۔

چیف نے پستول دوبارہ کھول کر اس کا چیمبر گھما دیا

اور پھر اچانک پستول بند کر دیا۔ اس نے سب کو ترجیحی نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ "معزز خواتین و حضرات آپ سب شریف، ایمان دار اور پارسا افراد ہیں۔ آپ ملک کی اس خفیہ تنظیم کے ساتھ بھی مخلص ہیں۔ میں کسی بھی فرد پر غداری کا الزام لگا کر اس پر کیچڑ اچھالنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ یہ بات بہت بڑا "گناہ" ہے کہ کسی پر بہتان باندھا جائے، لہذا میں اس آخری گولی کا ہی فیصلہ تسلیم کروں گا دیکھئے، یہ گولی کیا فیصلہ کرتی ہے۔ میں اس عمل کا آغاز خود سے کرتا ہوں۔ میری آپ سب کے لیے دلی دعا ہے کہ آخری گولی صرف غدار کا ہی کام تمام کرے۔ مجھے اس طریقے پر بھروسہ ہے۔ میں چند سال قبل بھی آخری گولی کی مدد سے غدار کو سزا دے چکا ہوں بلکہ قسمت غدار کو خود ہی ڈھونڈ لیتی ہے۔"

چیف نے پستول کی نالی اپنی کپٹی پر رکھی، آنکھیں بند کیں اور پستول کی لمبی دبا دی

"ٹک۔"

اس نے آنکھیں کھول کر خدا کا شکر ادا کیا اور پستول شاہ صاحب کے حوالے کیا۔ شاہ صاحب نے گہرا سانس لیا اور پستول کی نالی اپنے سر پر رکھ کر پستول چلا دیا

"ٹک۔"

شاہ صاحب جی کر مراٹھے تھے۔ انہوں نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پستول عبدالقیوم صاحب کے حوالے کر دیا۔ عبدالقیوم صاحب چار بچوں کے باپ تھے انہوں نے زیر لب خدا سے دعا کی۔ ساری دنیا ان کے سامنے پل بھر میں سمٹ آئی۔ وہ غدار تو نہیں تھے مگر اس آخری گولی کا بھلا کیا بھروسہ۔ انہوں نے خالق کائنات کو پکار کر پستول کی نالی اپنے ماتھے پر رکھی اور اس کی لمبی دبا دی۔

"ٹک۔"

وہ بچ گئے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں شکرانے کے نفل ادا کرنے کا تہیہ کر لیا۔

پستول اب شمشہ کے ہاتھ میں تھا۔ شمشہ سخت گیر عورت دکھائی پڑتی تھی۔ عمر چالیس سال، تین بیٹوں کی ماں اور ایک بوڑھی بیمار ماں کی واحد خبر گیر۔ اس نے پستول تمام کر قدرے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا: "چیف میں غدار نہیں ہوں، آپ میرا ریکارڈ چیک کر لیں اور کوئی ثبوت مل جائے تو مجھے الٹا اڑکا کر میری چوڑی اتار دیں، پھر مجھے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیں۔"

"نہیں، آپ تو بہت اچھی ہیں۔" چیف نے طنز کیا۔

"تو پھر؟"

"پھر فیصلہ آخری گولی کا ہو گا، جو اس پستول کے چیمبر میں گھوم رہی ہے۔"

"چیف میرے تین چھوٹے چھوٹے بیٹے ہیں جو رات کے کھانے پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور میری بوڑھی

ماں میرا حد درجہ شریف خاندان۔"

"اوہ آپ مجھے رلانے والی باتیں نہ کریں۔" چیف کی آواز بھی رندہ گئی۔ وہ اگرچہ اداکاری کر رہا تھا مگر کامیاب اداکاری کر رہا تھا۔

چیف کے بے لچک رویے اور بے لحاظ نظروں نے شمشہ کو بتا دیا کہ اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ تب اس نے لرزتے ہاتھ سے پستول بلند لیا۔ پستول کی نالی اپنے سر پر رکھ لی اور کلمہ توحید کا ورد کرتے ہوئے لمبی دبا دی۔

آواز صرف "ٹک۔" کی ابھری

چیف نے اسے نئی زندگی کی مبارک باد دی، جو اس نے شکر یہ کے ساتھ قبول کی۔

پستول اب مس کرن کے پاس تھا۔ کرن تیس سالہ لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر حد درجہ معصومیت کا غلبہ تھا۔ چیف نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ آخری گولی اس پستول میں جہاں کہیں بھی تھی، گھوم گھام کر پستول کے نالی کے عین سامنے یا بالکل قریب آچکی تھی۔ پستول چار بار چلایا جا چکا تھا اور اب خطرہ نوے فیصد سے بھی بڑھ چکا تھا، آریا پار والا معاملہ تھا۔

"گولی چلائیں مس کرن" چیف نے اسے حکم دیا۔

تب پستول کرن کی گود میں پڑا تھا۔ اس نے شش و پنج میں مبتلا ہو کر پستول تمام لیا۔ اس نے ذرا ٹھہر کر کہا: "اندھی گولی کا فیصلہ اندھا ہوگا، میں نے کیا کیا ہے چیف کہ مجھے بھری جوانی میں موت کی گھاٹی میں دھکیلا جا رہا ہے۔"

چیف نے سخت لہجہ اختیار کیا: "اس پستول میں چھ گولیوں کی جگہ ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ آخری گولی اب نالی کے سامنے پہنچ چکی ہو۔ معاملہ اگرچہ بہت خطرناک تھا مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے بعد میں پستول کو اپنی کپٹی پر رکھ کر چلائوں گا اگر ایسا وقت یا تو" چیف نے ان سب کو دیکھ کر کہا۔ "میں خود کو سب سے پہلے سزاوار سمجھتا ہوں، اس لیے اس عمل کا آغاز میں نے خود سے کیا تھا اور انجام بھی وقت پڑنے پر خود ہی پر کروں گا مس کرن بے دھڑک گولی چلائیں اگر یہ غدار وطن نہ ہوئیں تو ان کی زندگی خواب نہیں ہو گی۔"

خوف زدہ کرن خاموش بیٹھی رہی۔

"مس کرن گولی چلائیں، اپنے چیف کا حکم ٹالنا بھی جرم ہے۔" پھر کرن نے اچانک ہاتھ سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ فضا دھماکے سے گونج اٹھی تھی۔ چٹان پر بیٹھے ہوئے آبی پرندے اور سمندری بگڑے اڑ گئے تھے۔ چیف جھج کر پتھر پر سے نیچے گرا تھا اور اس نے اپنا سینہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تمام رکھا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے ریت پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ کرن ماہر نشانہ انداز تھی وہ کئی بار نشانہ اندازی کے مقابلوں میں انعام حاصل کر چکی تھی۔ اس نے اپنے فن کا مظاہرہ چیف کے عین دل پر کیا تھا۔ چیف کا حکم نہیں ٹالا تھا۔ گولی تو چلائی تھی مگر اپنے سر پر نہیں، چیف کے سینے پر کرن نے وہ پستول پھینک

کر اپنے لباس میں سے ایک مائوزر نکال کر باقی ماندہ افراد پر تان لیا تھا تاکہ کوئی اسے روک نہ سکے۔ وہ اگلے قدموں پیچھے ہٹ رہی تھی تاکہ چند قدم دور جا کر اپنی گاڑی میں سوار ہو سکے۔ اس نے گھوم کر اپنی گاڑی کی طرف دیکھا اور یہی لمحہ قیامت بن گیا اچانک اسے کسی نے فضا میں گیند کی طرح اچھال دید۔ وہ منہ کے بل زمین پر گری تو مائوزر بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کو شاید صاحب نے اپنے پٹکے میں قابو کر لیا۔ اس پر حیرت کا پہلا ٹوٹ پڑا کہ خاک میں غلطاً چیف پتھر پر پاؤں دھرے کھڑا تھا اور اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ چیف کے ہاتھ میں ایک چھوٹا پستول تھا جو اس نے یقیناً اپنے اوئی مفلز میں سے نکالا تھا وہ آخری گولی سے بچ نکلا تھا۔

چیف نے کہا: "مجھے تجھ پر پہلے ہی یقین کی حد تک شک تھا۔ میری خفیہ اطلاع کے مطابق تو نے ہیروں والے زبورات خریدے ہیں اور دنیا کے ایک مہنگے شہر میں بنگلہ بھی۔ کرن بی بی وہ آخری گولی، پٹاخا گولی تھی۔ میں اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ غدار تلاش کرنے کے لیے اندھی گولی کی مدد لیتا۔ میں نے جب جیمبر کو گھمایا تو بند کرتے وقت میں نے پستول کا جیمبر اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کی مدد سے یوں روکا تھا کہ پٹاخا گولی پانچویں خانے میں تھی۔ میں نے تم لوگوں پر نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا اور یوں غدار لڑکی پکڑی گئی۔"

کرن جب تم مائوزر تمام کر قدم قدم، اگلے پاؤں پیچھے ہٹ رہی تھی تو میری طرف تیرا دھیان نہیں تھا اور جب تم نے گاڑی کی طرف پلٹ کر مجھے ایک لمحہ دیا تو میں نے تجھے اٹھا کر فضا میں اچھال دیا، شاید تیرے علم میں نہ ہو کہ میں ایک ماہر نفسیات ہوں اور نہجا ماسٹر بھی۔"

§§§

بہادر لڑکا

مصنف: یوسف

تو وہ اسے روکیں۔ لیکن قاضی اور بادشاہ نے بھی میرے ساتھ انصاف نہ کیا اب میرا آخری سہارا خدا کی ذات تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ جلاوطنی تلوار لے کر میرے سر پہ پہنچ گیا اور خدا کا انصاف بھی ظاہر نہیں ہو رہا۔ بس یہ بات سوچ کر مجھے ہنسی آگئی۔

لڑکے کی یہ بات سنی تو بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے حکم دیا کہ لڑکے کو چھوڑ دو۔ ہم یہ بات پسند نہیں کرتے کہ ہماری جان بچانے کے لیے ایک بے گناہ کی جان لی جائے۔

لڑکے کو اسی وقت چھوڑ دیا گیا۔ بادشاہ نے بہت محبت سے اسے اپنی گود میں بٹھا کر پیار کیا۔ اور قیمتی تحفے دے کر رخصت کیا۔ کہتے ہیں۔ اسی وقت سے بادشاہ کی بیماری گھٹنی شروع ہو گئی اور چند دن میں ہی وہ بالکل تندرست ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ بر لب دریائے نیل اک فیل ہاں اپنی دھن میں زیر لب کرتا تھا کچھ ایسا بیاں غور کر ہاتھی کے پیروں میں جو ہو گا تیرا حال ہو گی تیرے پاؤں میں بس یونہی مور ناتواں

وضاحت: اس حکایت میں حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے یہ کلتہ بیان کیا ہے۔ کہ جان خواہ بادشاہ کی ہو یا غریب کی، قدر و قیمت میں دونوں برابر ہیں۔ نیز یہ کہ خود غرض بن کر دوسروں کی جانیں پامال کرنے والے دنیاوی لحاظ سے بھی اتنے فائدے میں رہتے جس قدر نفع میں خلق خدا پر رحم کرنے والے رہتے ہیں۔

§§§

بیان کیا جاتا ہے۔ ایک بادشاہ کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو گیا کافی دن علاج کرنے کے باوجود جب اسے آرام نہ آیا تو طبیعوں نے صلاح مشورہ کر کے کہا کہ اس بیماری کا علاج صرف انسان کے پتے سے کیا جاسکتا ہے اور وہ بھی ایسے انسان کے پتے سے جس میں یہ یہ خاص نشانیاں ہوں۔ یہ کہہ کر حکیموں نے وہ نشانیاں بتائیں اور بادشاہ نے حکم دے دیا کہ شاہی پیالے سارے ملک میں پھر کر تلاش کریں اور جس شخص میں یہ نشانیاں ہوں اسے لے آئیں۔ پیالوں نے فوراً تلاش شروع کر دی۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ وہ ساری نشانیاں ایک غریب کسان کے بیٹے میں مل گئیں۔ پیالوں نے کسان کو ساری بات بتائی کہ بادشاہ کے علاج کے لیے تیرے بیٹے کے پتے کی ضرورت ہے۔ اسے ہمارے ساتھ بھیج دے اور اس کے بدلے جتنا چاہے روپیہ لے لے کسان بہت غریب تھا۔ ڈھیر سارا روپیہ ملنے کی بات سن کر وہ اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ سپاہی اس کے بیٹے کو لے جائیں۔ چنانچہ وہ اسے بادشاہ کے پاس لے آئے۔

خاص نشانیاں والا لڑکا مل گیا تو اب قاضی سے پوچھا گیا کہ اسے قتل کر کے اس کے جسم سے پتا نکالنا جائز ہو گا یا نہیں! قاضی صاحب نے فتویٰ دے دیا کہ بادشاہ کی جان بچانے کے لیے ایک جان کو قربان کر دینا جائز ہے۔



قاضی کے فتوے کے بعد لڑکے کو جلاوطن کر دیا گیا کہ وہ اسے قتل کر کے اس کا پتا نکال لے لڑکا بالکل بے بس تھا۔ وہ اپنے قتل کی تیاریاں دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ لیکن جب جلاوطنی تلوار لے کر اس کے سر پہ کھڑا ہو گیا تو اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

بادشاہ خود اس جگہ موجود تھا۔ اس نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ جلاوطن کے ہاتھ میں تنگی تلوار دیکھ کر تو بڑے بڑے بہادر خوف سے کانپنے لگتے ہیں۔ اس نے جلاوطن کو رکنے کا اشارہ کر کے لڑکے کو اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا لڑکے۔ یہ تو بتا، اس وقت مسکرانے کا کون سا موقع تھا؟

لڑکے نے فوراً جواب دیا، حضور والا دنیا میں انسان کا سب سے بڑا سہارا اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میرے ماں باپ نے روپے کے لالچ میں مجھے حضور کے سپرد کر دیا۔ ماں باپ کے بعد دوسرا سہارا انصاف کرنے والا قاضی اور بادشاہ ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی ظالم کسی کو ستائے

بھوت

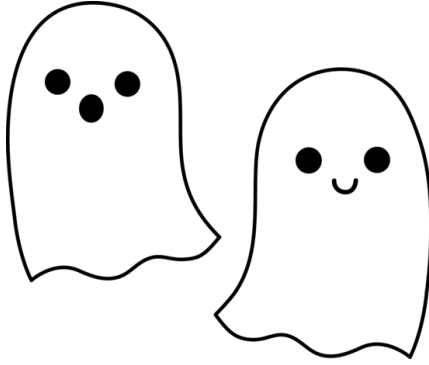
مصنف: یوسف

قدیم گرجا گھر کی اونچی اونچی دیواروں پر بہت سے تراشیدہ پتھر رکھے ہوئے، ان میں سے کچھ فرشتوں کے مجسمے تھے، کچھ پادریوں اور بادشاہوں کے اور کچھ پاکیزہ شخصیات کے۔ گرجا گھر کے ایک کونے میں ایک بدرنگ اور بے ڈھنگا پتھر پڑا تھا، جس پر نہ کوئی تاج بنا ہوا تھا، نہ ہی اس کی کوئی شکل و صورت سمجھ آ رہی تھی۔ گرجا گھر میں رہنے والے موٹے نیلے کبوتروں نے سمجھا کہ شاید کوئی بھوت ہے مگر مذہبی رسومات کے انچارج کوئے نے انہیں بتایا کہ یہ ایک گم شدہ روح ہے۔ سردیوں کا کوئی دن تھا، گرجا گھر کے چھت پر ایک سریلی آواز والے پرندے کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی، جو سخت سردی کے باعث دھوپ تلاش کرتا ہوا گرجا گھر کی باڑ پر آ بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ معصوم پرندہ ایک فرشتے کے مجسمے پر آ بیٹھا، وہ چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد یہاں گھونسا بنالے۔



گرجا گھر میں موجود چڑیوں اور کبوتروں نے اسے وہاں رہنے سے روک دیا اور اس قدر شور مچایا کہ اسے وہ جگہ چھوڑنا پڑی۔ معصوم پرندہ وہاں سے اڑ کر، گم شدہ روح کی تصویر والے بد صورت پتھر پر جا بیٹھا اور اسے ہی پناہ گاہ بنالیا۔ گرجا گھر کے کبوتر اس پتھر کو محفوظ جگہ نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ ایک تو وہ گمنام سے کونے میں پڑا تھا دوسرا اس پر ہر وقت گہرا سایہ موجود رہتا تھا۔ گم شدہ روح کا مجسمہ اگرچہ بدرنگ تھا اور اس کے بازو اس طرح کھلے ہوئے بنے تھے جیسے وہ اپنے دشمن کو لٹاکر رہا ہو، لیکن اس سے کسی کو کوئی تکلیف نہ تھی، معصوم پرندہ وہیں رہنے لگا۔ وہ روزانہ خاموش مجسمے کے اوپر چڑھ جاتا اور خوابوں میں کھوئے دوسرے مجسموں کو دیکھتا رہتا، معصوم اور کمزور پرندے کے لیے

یہ واحد محفوظ پناہ گاہ تھی اور وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا، روزانہ وقفے وقفے سے مجسمے کے اوپر بیٹھتا، کبھی قریبی ستون پر چڑھ جاتا اور مجسمے کی محبت اور پناہ دینے کے لیے شکر یہ کے طور پر گیت گاتا رہتا۔ یہ بد صورت پتھر کے لیے خوشی کے دن تھے کیونکہ اس کا مہمان پرندہ روزانہ وہاں چہکتا، ہر روز سریلی آواز میں گیت گاتا، شام کو گرجا گھر کی گھنٹی بجتی تو چوگاڑو دینگے ہوئے آہستگی سے اپنے گھروں سے نکل آتے اور پرندہ گیت گاتا رہتا۔



یہ موسم کی تبدیلی تھی یا طوفانی بارشوں کا اثر یا کوئی وجہ تھی کہ بد صورت پتھر کی سختی اور اس کی شکل میں خوشگوار تبدیلی آ رہی تھی۔ گرجا گھر کی چھت پر خوبصورت نفعے سناتے پرندے کی آواز سب کو پسند تھی مگر وہ اس پر افسوس کرتے یہ آواز ہمیشہ رہنے والی نہیں، یہ خوبصورت گیت ختم ہو جائیں گے اور گرجا گھر کی دیواریں معصوم پرندے کو بھول جائیں گی۔ گرجا گھر کے مکینوں نے، ایک دن معصوم پرندے کو پتھرے میں قید کر کے گرجا گھر کے باہر فروخت کرنے کے لیے رکھ دیا تاکہ کچھ معاشی فائدہ حاصل کیا جاسکے۔ وہ رات معصوم پرندے پر بہت بھاری تھی، جو اس نے اپنے ٹھکانے سے دور گزاری۔ دوسرے بد صورت پتھر پریشان ہوا کہ پرندہ واپس کیوں نہیں آیا، اس نے سوچا شاید اسے بلی کھا گئی ہے یا پھر کسی نے پتھر مار کے زخمی کر دیا ہے، مہمان پرندے کے بغیر گم شدہ روح کے بد صورت مجسمے کو پہلی تنہائی کا شدید احساس ہوا۔

صبح سویرے جب گرجا گھر کی چڑیوں کا شور اٹھا اور لوگوں کی چہل پہل شروع ہوئی تو اسے معصوم پرندہ بہت یاد آیا، جب کبوتر گرجا گھر کو اونچی دیواروں کے کنگروں پر بیٹھتے اور چڑیاں چہکتیں تو اس کے کانوں میں معصوم پرندے کے گیت گونجنے لگتے۔

گم شدہ روح کا مجسمہ بہت اُداس اور غمزدہ تھا۔ کبوتر کھاتے وقت ہمیشہ اس معصوم پرندے کا ذکر کرتے اور کہتے کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ شدید سردی کے ایک دن اور کبوتر چڑیوں کے ساتھ گرجا گھر کی چھت خوراک کے لیے پریشان بیٹھے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ کوئی اپنا بچا ہوا کھانا چھت پر پھینکے تاکہ ان کی بھوک مٹ سکے، وہ

اکثر سردیوں میں اسی طرح گزارہ کرتے تھے، اس دوران میں ایک کبوتر نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ کیا کچرے کے ڈھیر پر کوئی کھانے کی چیز پھینکی گئی ہے، جواب میں کبوتر کو بتایا گیا کہ نہیں، وہاں صرف ایک مردہ پرندے کو پھینکا گیا ہے۔

رات گئے گرجا گھر کی چھت پر کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مذہبی رسومات کے انچارج کوئے نے کہا کہ گرجا گھر کے کنگرے مدتوں سے موسم سرما کی شدت برداشت کر رہے ہیں، برفباری اور کھرے کے سبب ان کی حالت خراب ہے، شاید کوئی حصہ ٹوٹ گیا ہو۔ اگلی صبح گم شدہ روح کا مجسمہ اپنی جگہ موجود نہ پا کر کبوتروں نے اطمینان کا سانس لیا انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب یہاں کسی اور فرشتے کا مجسمہ نصب کیا جائے گا، گم شدہ روح کے مجسمے کو کسی نے ٹوڑ کر باہر پھینک دیا تھا۔

ترقی

مصنف: یوسف



جب کمائی بڑھنے لگی تو جھرو کی بیوی جمیلی کے دل میں لالچ پیدا ہوا اور وہ کمائی کے پیسوں میں سے کچھ پیسے الگ نکال کر اپنے اور اپنے بچوں کا شوق پورا کرنے لگی اور منگو کی بیوی بیلا اور اس کے بچوں سے بھید بھاد کرنے لگی۔ بیلا اس کی ان حرکتوں کو سمجھ گئی، جمیلی فضول خرچ اور لالچی تھی وہ چالاکی سے اپنے داو پیچ چلاتی جب کہ بیلا سمجھ دار اور اچھی عادتوں کی مالک تھی۔ ایک دن بیلا نے جمیلی سے کہا کہ کیوں نہ ہم دونوں اپنا کام الگ الگ کریں اور اپنی اپنی کمائی بھی اپنے پاس رکھیں جمیلی کو یہ بات پسند آئی اور وہ مان گئی۔

کچھ دنوں بعد جھرو اور منگو بھی اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ الگ الگ رہنے لگے۔ جمیلی کی لالچی طبیعت اور فضول خرچی کی خراب عادتوں کی وجہ سے جھرو اور اس کے خاندان کے لوگ پریشان رہنے لگے۔ جب کہ بیلا کی سمجھ داری اور کفایت شعاری سے منگو ترقی کرنے لگا۔ بیلا تھی تو سمجھ دار لیکن پڑھی لکھی نہیں تھی اس نے پڑھنا لکھنا سیکھا اور منگو کو بھی سمجھایا کہ علم سیکھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی، جب جاگے تب سویرا، منگو نے بھی پڑھنا سیکھ لیا اور ترقی کرتے ہوئے اپنے بچوں کو اعلا تعلیم دلوائی آج منگو اور بیلا کے بچے ڈاکٹر اور انجینئر بن گئے ہیں، جب کہ جھرو اور جمیلی اپنی خود کی حرکتوں سے گاؤں سے بھی نچلے درجے کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ ہوا یوں کہ اس دوران جمیلی بھی مر گئی۔

یہ بات منگو کو پسند نہ آئی کہ اس کا دوست جھرو اس طرح پریشان رہے اُس نے بڑھ کر اپنے دوست کی مدد کی اور اُس کے بچوں کی تعلیم کے لیے اچھا انتظام کیا اور نائٹ اسکول میں ان کا داخلہ کراوید۔ دھیرے دھیرے ایک دوست کی مدد سے دوسرا دوست بھی ترقی کرنے لگا۔ اب جھرو کے بچے بھی ٹیچر بن کر محنت سے پڑھانے کا کام کر رہے ہیں۔ سچ ہے کہ فضول خرچی سے ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے جب کہ کفایت شعاری سے ترقی ہوتی ہے۔

§§§



یہ دونوں کبھی بھی گاؤں سے باہر نہیں گئے تھے۔ اس لیے شہر جانے سے ڈرتے تھے۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ اب کی بار گاؤں کی جاترا میں جب شہر کے لوگ آئیں گے تو ہم دونوں ان کے ساتھ شہر چلے جائیں گے۔

جھرو اور منگو شہر آ گئے۔ شہر کی چکا چونڈھ سے وہ جھونچکے رہے گئے۔ کام کی تلاش میں دونوں کئی دنوں تک بھٹکتے رہے وہ جہاں بھی کام کی تلاش میں جاتے تو لوگ ان کے بارے میں پوچھتے اور کیا کام کر سکتے ہو یہ پوچھتے۔ وہ دونوں شہر کے لوگوں کے سامنے کچھ ڈھنگ سے بول بھی نہیں پاتے تھے۔ اور لوگ انہیں دھتکار کر اپنے پاس سے بھگا دیتے۔

ایک دن ہمت کر کے کام ڈھونڈنے نکلے تو اتناج کے گودام میں کام مل گیا۔ کام تھاناچ کی بوریاں ڈھونا، جھرو اور منگو حتمی تو تھے ہی، اپنی محنت اور لگن سے کام کرنے لگے اب دھیرے دھیرے ان کی تکلیفیں دور ہونے لگیں۔ جھرو اور منگو اپنی کمائی کے پیسے اکٹھے ہی رکھتے اور تھوڑی بہت بچت بھی کرتے۔ دن گذرتے گئے اب ان کے رہنے کا مسئلہ بھی دور ہو گیا، انھوں نے کرایے پر ایک کمرہ لے لیا اور گاؤں جاکر اپنے اپنے خاندان کو شہر لے آئے دونوں کی بیویاں جمیلی اور بیلا بھی کام کرنے لگیں اور اپنی کمائی ساتھ ہی رکھنے لگیں ان دونوں کے بچے پڑھنے کے لیے اسکول بھی جانے لگے۔

میں آتا مجھے نہیں گرا سکتے تھے۔“

”میں بے کار میں نہیں ڈر رہا ہوں۔ بل کہ صحیح معنوں میں ڈر رہا ہوں۔“ چھد کو نے کہا اور پھر سرگوشی کے انداز میں چپیں چو کو بولنے لگا کہ: ”میں تو کہوں گا کہ اب تم بھی اُس کے ساتھ کھیلتا چھوڑ دو۔ نہیں تو وہ کسی دن تمہیں بھی ضرور دھوکا دے گا۔ اور تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے۔“

”یہ سب سراسر غلط ہے۔“ چپیں چو بولی۔

”غلط بات نہیں ہے۔“ چھد کو نے بات کاٹی اور آگے بولا: ”کیا بلی اور کتے کی کبھی دوستی رہ سکتی ہے۔ بلی کتے کو دیکھ کر ہمیشہ ڈرتی رہی ہے۔ کوئی وجہ ہوگی تب ہی تو بلی کتے سے ڈرتی ہے۔ میں نے تمہاری بھلائی کے لیے یہ نصیحت کی ہے اب تمہاری مرضی تمہیں اس کے ساتھ کھیلتا ہے کیلو یا مت کیلو۔ لیکن یاد رکھنا وہ ضرور کسی دن تمہیں دھوکا دے گا۔“ چھد کو نے پھر سے یہ بات دہرائی کہ: ”وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے۔“



”یہ بات تو ٹھیک ہے کہ بلی اور کتے کی کبھی نہیں نصیحتی لیکن یہ سب کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست ہیں۔“ چپیں چو نے چھد کو سے کہا۔

”اچھا! دوسری مثال بھی سنو۔“ چھد کو بولا: ”شیر اور ہرن میں کبھی دوستی نہیں سنی گئی۔ جب بھی شیر ہرن کو دیکھتا ہے، وہ اس کو مارنے دوڑتا ہے۔ اگر پکڑ لیتا ہے تو وہ ہرن کو مار ہی ڈالتا ہے۔ اس لیے شیر ہرن کو دیکھ کر بھاگتی ہے۔ اسی طرح بلی اور کتے کا معاملہ ہے۔“

”میں تمہاری اس بات سے اختلاف نہیں کرتی۔“ چپیں چو نے کہا اور بولی: ”بل کہ میں ایک مثال اور دیتی ہوں، وہ بھی کسی دوسرے کی نہیں خود اپنی یعنی بلی اور چوہے کی۔ بلی چوہے کی دشمن ہے، وہ جہاں کہیں چوہے کو دیکھتی ہے اس کو مار ڈالتی ہے۔ لیکن کہیں بلی اور چوہے کی دوستی ہوئی ہے؟ میری اور تو تو کی دوستی کی بات الگ ہے۔“

اس کے بعد تو تو کہیں سے گیند اٹھا لایا۔ دونوں کچھ دیر گیند سے کھیلتے رہے۔

شام ہو رہی تھی۔ تو تو بولا: ”چپیں چو! اب میں گھر جاؤں گا۔ آج تو کھیلتے کھیلتے تھک گیا ہوں۔ ماں انتظار کر رہی ہوگی۔ آج وہ کچھ دیر بعد مجھے کہیں گھمانے لے جائیں گی۔“

”تو جلدی جاؤ!“ چپیں چو بولی۔ ”میں بھی تھک گئی ہوں۔ لیکن کل مجھے ضرور بتانا کہ تم کہاں گھومنے گئے تھے۔“ وہ پھر بولی۔ ”کل میری ماں مجھے کچھ نئی چیز کھانے کو دینے والی ہیں مگر مجھے بتایا نہیں ہے۔ دیکھیں کیا دیتی ہیں؟“

تو تو اپنے گھر چل دیا اور چپیں چو اپنے گھر۔ دونوں کو الگ الگ سمت جانا تھا۔

جب چپیں چو اپنے گھر جارہی تھی۔ راستے میں چھد کو بندر ملا۔ وہ درخت کی ایک شاخ پر بیٹھا تھا۔ چپیں چو کو دیکھتے ہی شاخ پر سے بولا: ”کھو کھو... کھو کھو۔“

چپیں چو سمجھ گئی کہ یہ چھد کو بندر ہے۔

”ارے بھئی! کیا حال ہے؟ نیچے تو آؤ۔“ چپیں چو بولی۔ ”کچھ کہنا ہے کیا؟“

”کہنا تو ہے لیکن نہیں کہوں گا۔ آج کل تو تم تو تو کے ساتھ زیادہ کھیلتی ہو۔ میں تو درخت کی شاخ پر اکیلا بیٹھا رہتا ہوں، تم کو تو میرا خیال ہی نہیں رہتا۔“ چھد کو نے شکایت کی۔

”تو تم بھی کھیلا کرو ہمارے ساتھ، بڑے برگد کے پاس آجایا کرو۔ وہیں تو تو آتا ہے ہم تینوں مل جل کر کھیلا کریں گے۔“ چپیں چو نے دوستانہ انداز میں کہا۔

”ہااا... ہااا... ہااا...“ چھد کو زور سے ہنسا اور کہنے لگا: ”میں تو۔ تو تو کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ نہ جانے کب وہ مجھے کاٹ لے؟ جب وہ جھوکتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے بالوں گرج رہا ہو۔ مجھے تو اُس سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”تم بے کار میں تو تو سے ڈر رہے ہو۔“ چپیں چو بولی۔

تین دوست

مصنف: یوسف

چپیں چو بلی اور تو تو کتا مل کر کھیل رہے تھے۔ چپیں چو نے تو تو کو دھکا مارا۔ تو تو گر پڑا۔ چپیں چو تالی بجانے لگی۔ ”گرا دیا، ... گرا دیا...“



تو تو اٹھ گیا۔ اس پر تھوڑی مٹی لگ گئی تھی۔ اس نے مٹی جھاڑی اور چپیں چو سے بولا: ”میں گراؤں تو کہنا مت کہ گرا دیا۔“ ایسا دھکا ماروں گا کہ تم لڑھکتی چلی جاؤ گی۔“

”تم گرا ہی نہیں سکتے۔“ چپیں چو ہنسنے لگی۔

”اچھا...“..... ”ہاں!“

”تو تیار ہو جاؤ۔“..... چپیں چو پہنچے گڑا کر کھڑی ہو گئی۔

تو تو جانتا تھا کہ چپیں چو پہنچے گڑا کر کھڑی ہو جائے گی اور وہ اسے گرانہیں پائے گا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس آیا اور دھکا مارا۔ چپیں چو ذرا سی ڈمگ کر رہ گئی۔

تم میں تو بہت طاقت ہے۔ میں سچ سچ تم کو نہیں گرا پایا۔“ تو تو بولا۔

”میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔“ اتنا کہہ کر چپیں چو آرام سے کھڑی ہو گئی۔ تو تو ہوشیاری سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اور تیزی سے آکر ایک دھکا مارا۔ چپیں چو زور سے لڑھک کر زمین پر گر گئی۔ اب تالی بجانے کی جاری تو تو کی تھی وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

چپیں چو اور تو تو دونوں بہت کھلڑے تھے وہ دونوں اس وقت مذاق ہی تو کر رہے تھے۔ چپیں چو کھڑی ہو گئی۔ اس نے بھی اپنے جسم پر لگی دھول مٹی جھاڑی اور بولی: ”ایسا دھکا دینے سے کیا ہوتا ہے؟ ذرا پہلے ہی بول کر دیتے تو سمجھ

اب بھدکو خود ہی بولا: ”میں نے ایک دن چیں چو سے کہا تھا کہ تو تو تمہیں کسی دن دھوکا دے گا، اُس کا ساتھ چھوڑ دو۔“

تو تو ہنسا: ”بس اتنی سی بات، اس کے لیے معافی مت مانگو۔ تمہارے دل میں شک تھا سو وہ آج دور ہو گیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔“

تو تو کتنے نے نے بھدکو بندر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بھدکو بندر کا ہاتھ چیں چو بلی نے پکڑ لیا اور تینوں کہتے جارہے تھے ہم تینوں دوست ہیں۔

§§§

دوسرے لڑکے نے کہا۔

اُن لڑکوں کی باتیں چیں چو نے بھی سنا اور تو تو نے بھی۔ تو تو بولا: ”چیں چو! تم نہیں رہو۔ میں ان لڑکوں کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں۔ یہ جیسے ہی غلیل چلانے جائیں گے۔ میں اتنی زور سے بھونکوں گا کہ یہ ڈر کر بھاگ جائیں گے۔ اپنی بھون بھون سے میں انہیں ایسا ڈراؤں گا کہ پھر کبھی بھی وہ اوھر آنے کی ہمت نہیں کریں گے۔“

”ٹھیک ہے، لیکن میں بھی اتنی ہوں۔ تم جا کر اُن لڑکوں کو ڈراؤ۔“ چیں چو نے کہا۔

لڑکے جلدی سے درخت کے پاس پہنچے۔ ایک لڑکے نے کہا: ”دیکھو میرا نشانہ کتنا صحیح ہے میں غلیل چلاؤں گا تو میرا ڈھیلا سیدھا بندر کے سر پر لگے گا۔“

تو تو کے قریب آکر چیں چو بھی کھڑی ہو گئی۔ بھدکو بندر درخت پر سے دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکا اس کو غلیل مارنے والا ہے۔ اُس نے سوچ لیا کہ جیسے ہی وہ لڑکا غلیل چلائے گا وہ چھلانگ لگا کر دوسری شاخ پر چلا جائے گا۔

لڑکے نے جیسے ہی غلیل سے نشانہ لگایا۔ تو تو نے ایسی زور سے بھون بھون بھونکا کہ وہ بُری طرح ڈر گئے اور غلیل وہیں پھینک کر نو دو گیارہ ہو گئے۔ بھدکو نے دیکھا کہ لڑکے ڈر کر وہاں سے بھاگ گئے اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ ان کو تو تو نے ڈرا کر بھگایا ہے۔

اب بھدکو بڑا شرمندہ ہوا۔ کہیں ڈھیلا اسے لگ جاتا تو؟ تو تو نے شرارتی لڑکوں کو بھگا کر اُس پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

بھدکو شاخ سے کود کر نیچے آیا اور تو تو سے بولا: ”بھیا! مجھے معاف کر دینا۔“

”کس بات کے لیے؟“ تو تو نے انہماک بن کر پوچھا۔ ”کیا چیں چو دیدی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“ بھدکو نے کہا۔

”نہیں مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔“ تو تو بولا اور چیں چو سے پوچھا: ”کیا بات ہے چیں چو؟“

”کچھ نہیں کوئی بات نہیں ہے۔“ چیں چو بولی۔ وہ تو تو کو کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ کہیں بھدکو اور تو تو میں دراڑ پڑ جائے۔

”میں نے جو سمجھا وہ تمہیں بتا دیا۔“ بھدکو بولا۔ ”تم میری اچھی دوست ہو۔ اس لیے تم کو بتا دیا، نصیحت کر دی، اب تمہاری مرضی تم میری بات مانو یا نہ مانو، لیکن یاد رکھنا وہ ضرور کسی دن تمہیں دھوکا دے گا۔“ بھدکو نے پر سے یہ بات دہرائی کہ: ”وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے۔“

چیں چو کو بھدکو کی یہ باتیں اچھی نہیں لگیں۔ یہ تو کسی کی برائی بیان کرنا ہوا، غیبت کرنا ہوا۔ برائی اور غیبت تو دشمن کی بھی نہیں کرنی چاہیے۔ غیبت کرنا یا کسی کی دوستی کو توڑنا یا کسی میں جھگڑا لگوانا اچھی بات نہیں ہے بل کہ یہ تو سب سے بڑا دھوکا ہے۔ اُس نے یہ باتیں بھدکو سے نہ کہی بل کہ من ہی من میں سوچتے ہوئے چپ چاپ اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔



چیں چو اور تو تو ہمیشہ کی طرح کھیلتے رہے، ہنستے بولتے، گاتے رہے۔ چیں چو روز بھدکو کو کھیلنے کے لیے بلاتی رہی لیکن وہ بار بار بلانے کے باوجود بھی کبھی ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے نہیں آیا۔ وہ یہی کہتا رہا کہ تو تو اُسے کاٹ لے گا، وہ مجھے پسند نہیں ہے۔ بل کہ وہ چیں چو سے اکثر کہتا کہ: ”وہ کسی دن تمہیں دھوکا دے سکتا ہے وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گا یا تمہاری دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے۔“

وقت گذرتا رہا کہ ایک دن جھاڑی کے قریب سے چند لڑکے جارہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں غلیلیں تھیں، وہ صورت شکل سے ہی بڑے شرارتی لگ رہے تھے۔ چیں چو اور تو تو جہاں کھیل رہے تھے وہ لڑکے وہیں سے گذرے تھے۔ اُن میں سے ایک نے کہا: ”میرا نشانہ ایسا پکا ہے کہ جس کو غلیل ماروں وہ بچ ہی نہیں سکتا۔ میں اڑتے ہوئے پرندے کا بھی نشانہ لگا سکتا ہوں۔“

”تو چلیں بندر کو غلیل ماریں۔“ ایک لڑکے نے کہا۔ ”وہ دیکھو! بندر شاخ پر بیٹھا ہے۔“

”ہاں دیکھیں! کس کا نشانہ صحیح بیٹھا ہے؟“ ایک

سیدھا راستہ

مصنف: یوسف

کی کہ میرا بہتر علاج ہو سکے مگر ایسا ممکن نہ ہو سکا میرے والد صدے سے بیمار رہنے لگے اور ذہنی مریض ہو گئے والد کی جمع پونجی سب ختم ہو گئی اور ایک دن والد بھی مجھے چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔ میں آج بھی پچھتاہوں ہوں کاش اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرتا، بیٹا دو باتیں ہمیشہ یاد رکھنا۔

(۱) انسان جتنی زیادہ بلندی سے نیچے گرتا ہے چوٹ اتنی ہی زیادہ گہری آتی ہے۔

(۲) کچھ لوگ راستے میں پڑے ہوئے پتھروں کی طرح ہوتے ہیں جو ہماری زندگی میں آتے ہیں جنہیں ہم بروقت پہچان کر ٹھوکر سے نہ بچ سکیں تو ہمیں بہت گہری چوٹیں لگ سکتی ہیں جو ہماری ساری زندگی تباہ و برباد کر سکتی ہیں، اور ہماری زندگی میں کچھ ٹریفک کے اشاروں کی طرح بھی ملتے ہیں جو ہمیں راستہ بتاتے ہیں مگر والدین ہمارے لیے ایک چراغ کی مانند ہوتے ہیں جو ہر سیدھا راستہ کی طرف روشنی دیکھاتے ہیں بس ہمیں اگر زندگی کا سفر آسانی سے طے کرنا ہے تو اپنے والدین کی فرمانبرداری کرنی چاہیے۔ بزرگ کی باتیں سن کر فیضان بہت پشیمان ہوا اور فیضان کو احساس ہوا کہ جانے انجانے میں وہ بہت بڑی غلطی کرنے جا رہا تھا فیضان کے لیے بزرگ فرشتہ بن کر آیا تھا جس سے فیضان کو ایک پل میں پوری زندگی بہتر بنانے کا سبق ملا تھا، فیضان کے دل پر بزرگ کی باتوں کا بہت اثر ہوا فیضان نے بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور فوراً گھر جا کر اپنے والدین سے معافی مانگی اور آئندہ کبھی خد نہ کرنے اور دل لگا کر پڑھائی کرنے کا وعدہ کیا فیضان کے والدین بہت خوش ہوئے اور اللہ کا شکر ادا کیا، فیضان نے خود سے عہد کیا کہ وہ خود بھی پڑھے گا اور وکی کو بھی سیدھے راستے پر لانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا، فیضان کی محنت رنگ لائی آٹھویں کلاس میں فیضان نے فرسٹ اور وکی نے دوسری پوزیشن حاصل کی دونوں دوست بہت خوش ہوئے سب اساتذہ نے فیضان اور وکی کو شاباش دی۔ ختم شدہ

فیضان کے بہت اچھے دوست آصف کو ہو گئی اور آصف نے فیضان کو ساری بات سے آگاہ کیا فیضان ساری بات سن کر حیران پریشان اور کنکشن کے عالم میں اسکول سے چھٹی کے وقت گھر جا رہا تھا کہ فیضان کی سائیکل راستے میں ایک پتھر سے ٹکرا گئی پاس ہی ایک بزرگ جو کہ بھیجک مانگ رہا تھا اس نے فیضان کو زمین سے اٹھنے میں مدد دی، اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر فیضان سے بزرگ نے پوچھا بیٹا کیسے گر گئے؟ فیضان کو معمولی خراش آئی تھی فیضان بڑبڑانے لگا اگر والدین میری بات مان لیتے موٹر سائیکل لے دیتے تو میں پرانی سائیکل سے نہ گرتا،



بزرگ نے کہا شکر ادا کرو کہ! یہ سائیکل کی وجہ سے معمولی چوٹ آئی ہے موٹر سائیکل کی چوٹ بہت بری ہوتی ہے یہ دیکھو بیٹا میرا ایک بازو موٹر سائیکل سے گرنے سے ہی ضائع ہوا تھا فیضان نے جب بزرگ کا ایک بازو کٹا ہوا دیکھا تو بہت خوف زدہ ہوا اور بزرگ سے پوچھنے لگا یہ کب اور کیسے ہوا بابا جی؟ بزرگ نے بتایا: بیٹا میں تمہاری عمر کا تھا اور یہ میری اپنی ضد اور نافرمانی کی وجہ سے ہوا، ورنہ شاید آج میں بھکاری نہیں ہوتا پڑھا لکھا افسر ہوتا میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا میرے والد مجھے اپنی طرح افسر بنانا چاہتے تھے مگر میں نے بری صحبت میں پڑ کر والدین کی محبت کو فراموش کر دیا تھا ان کے خلوص سے دیے ہوئے سائیکل کو ٹھکرا کر موٹر سائیکل کی ضد تو پوری کروا لی تھی مگر اس کا نتیجہ اب تک بھگت رہا ہوں میری موٹر سائیکل کے آگے پتھر ہی آیا تھا جسے میں دیکھ نہیں سکا تھا اور بری طرح سڑک پر جا گرا تھا میرے بازو کو ایک تیز رفتار گاڑی پکل گئی تھی میری ماں میرے ایکسیڈنٹ کی خبر برداشت نہ کر سکی اور اللہ کو پیاری ہو گئی میرے والد میری دیکھ بھال کی وجہ سے افس نہیں جاسکتے تھے میرے والد نے ہر ممکن کوشش

فیضان بہت بپا را بچہ تھا اپنے امی ابو کا راج ڈلارا تھا فیضان کے ابو محنت مزدوری کر کے فیضان کو تعلیم دلوا رہے تھے فیضان کی امی بھی فیضان کا بہت خیال رکھتی تھیں، غربت کے باوجود والدین فیضان کی ہر خوشی کا خیال رکھتے تھے، اچھا کھانا پینا تعلیم اچھا لباس کھیل کود سیر و تفریح غرض یہ کہ فیضان کو ہر چیز ناممکن نہ مہیا ہوتی تھی بعض دفعہ تو والدین خود بھوکے سو جاتے مگر فیضان کو کسی قسم کی تنگی نہیں آنے دیتے تھے فیضان پچیس کلاس میں ہوا تو فیضان کی امی نے فیضان کی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنی شادی کی واحد نشانی سونے کی انگوٹھی بیچ کر فیضان کو سائیکل لے دی فیضان بہت خوش ہوا کہ اسے سائیکل مل گئی ہے اب فیضان کو پیدل اسکول نہیں جانا پڑتا تھا، فیضان پڑھائی میں بہت اچھا تھا ہمیشہ فرسٹ پوزیشن لیتا تھا سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا، جب فیضان آٹھویں کلاس میں ہوا تو ایک امیر باپ کے ضدی بیٹے وکی سے فیضان کی دوستی ہو گئی وکی بہت ضدی اور پڑھائی میں کمزور تھا وکی اپنی موٹر سائیکل پر سکول آتا تھا اور فیضان کی پرانی سائیکل دیکھ کر بہت ہنستا تھا اور فیضان کا مذاق اڑاتا تھا، اساتذہ فیضان سے بہت خوش تھے اور وکی ہمیشہ اساتذہ سے ڈانٹ کھاتا تھا وکی فیضان کو اکثر الٹی سیدھی باتیں کر کے آسانے لگا ایک دن وکی نے فیضان سے کہا تم بھی موٹر سائیکل لے لو پرانی سائیکل کی جان چھوڑ دو، پہلے تو فیضان نے وکی کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا مگر وکی نے بھی ٹھان رکھی تھی کہ فیضان کو پڑھائی میں خود سے آگے نہیں جانے دے گا، اور اپنی طرح کمزور کرے گا تاکہ اساتذہ فیضان کی قدر نہ کریں۔

آخر کار وکی اپنے ارادے میں کامیاب ہونے لگا، فیضان ہر روز والدین سے موٹر سائیکل کی خد کرنے لگا فیضان کے والدین کے پاس اتنے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے فیضان کے والدین پریشان رہنے لگے تھے، فیضان کے سالانہ امتحان نزدیک تھے اور فیضان نے اپنی ضد میں پڑھائی پر توجہ بھی کم کر رکھی تھی، والدین نے فیضان کو بہت سمجھایا کہ پڑھ لکھ کر جب بڑے آدمی بنو گے تو ہر چیز تمہیں آسانی سے مل سکے گی یہ وقت بہت قیمتی ہے اسے ہاتھ سے مت گنواؤ مگر فیضان وکی کی وہی باتیں دہراتا کہ آپ مجھے پیار نہیں کرتے ورنہ مجھے وکی کے ابو کی طرح ہر قیمتی چیز لے کر دیتے، وکی ٹھیک کہتا ہے آپ مجھے اپنی خاطر پڑھا رہے ہیں تاکہ میں بڑھاپے میں آپ کو پیسے کما کے لا کر دیا کروں فیضان کے والدین جب ہر طرح سے فیضان کو سمجھا کر تھک گئے تو انھوں نے اپنے چھوٹے سے گھر کا آدھا حصہ بیچ کر فیضان کی ضد پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا وکی کے سارے ارادوں کی خبر

